© rasailojaraid.com

اجتہادی بصیرت اور تعلیم

پروفیسر ساجد حمید، ایسوسی ایٹ پروفیسر
یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب، لاہور

ہمارا قدیم طرز تعلیم اپنی روایتی محنت، لگن اور عمدگی سے محروم ہو چکا ہے اور جدید طرزِتعلیم نے تو عمدگی کا لباس ابھی پہنا ہی نہیں ہے کہ محرومی کا ذکر کیا جائے۔قدیم و جدید کے اس انحطاط کا نتیجہ وہ نکلا ہے جس کی طرف اقبال نے توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

اس قحط الرجال سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم یوں دی جائے کہ وہ ہر ذہین طالب علم میں اجتہادی بصیرت پیدا کرے، اسے اجتہاد کی اجازت بے شک نہ بھی دی جائے،لیکن علمی میدان میں اس کی مہارت بہر حال اسی درجے کی ہونی چاہیے۔علمی میدان میں اجتہادی بصیرت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ علم اس طرح سے سکھایا جائے کہ وہ بصیرت پیدا کرنے والا ہو۔ ہمارے خیال میں تعلیم دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔

۱- علم (یعنی نصاب)
۲- تدریس

میں اس مضمون میں اصلا بات نصاب کی کروں گا، اور میرے پیش نظر وہ جدید ادارے ہیں جو دینی تدریس دے رہے ہیں۔ قدیم ادارے بھی ایسا کرلیں تو ان سے زیادہ اچھے نتائج کی توقع ہے۔نصاب وہ چیز ہے، جو اگر درست طریقے سے مرتب ہوئی ہو، تو ایک عام سا استاد بھی کلاس روم میں اچھے نتائج حاصل کرلیتا ہے۔مغرب میں درسی کتب کی تصنیف میں بہت اہم اصلاحات ہوئی ہیں۔ بات کو کیسے کیا جائے کہ وہ کتاب بہت واضح اور صاف ہو جائے۔محض اچھی طرح پڑھ لینے ہی سے بات کھل جائے۔میرے خیال میں علوم اسلامیہ کی تدریس کے لیے نصابات میں درج ذیل اصلاحات کی ضرورت ہے۔

۱- علمی سطحوں کا تعین
۲- بتدریج تعلیم
۳- تقلید کی متوازن پابندیوں کے ساتھ غیر مقلدانہ تعلیم
۴- عربی زبان کی تعلیم
۵- نصاب میں جدید علوم کا قابل قدر حصہ
۶- طرز نگارش
۷- نصاب کی تشکیل: ذہانتوں کی آبیاری

علمی سطحوں کا تعین

اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر سبق کو کم از کم درج ذیل تین سطحوں میں بانٹ لینا چاہیے، اس سے بھی زیادہ سطحیں بن سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

۱- اطلاع
۲- تفہیم
۳- معرفت

پہلی سطح

پہلی سطح ہے اطلاع کی(inform کرنے کی)ہے۔ یعنی طالب علم کو اس موضوع کی تمام ضروری معلومات سے مطلع کرنا۔ضروری سے میری مراد وہ معلومات ہیں جن کے بغیر وہ علم مکمل نہیں ہوتا۔مثلا نکاح کے احکام کے باب میں اسے بتایا جائے کہ

۱- متعلقہ اہم الفاظ اور اصطلاحات، مثلا نکاح، خطبہ نکاح، گواہی وغیرہ کس کو کہتے ہیں۔
۲- بنیادی تصورات سے آگاہ کرنا، جیسے نکاح ایک معاہدہ ہے، وغیرہ۔
۳- قرآن و سنت کی وہ کون سی نصوص ہیں،جس پر اس قانون کا مدار ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴- ان آیات کا بنیادی مفہوم و مدعا جو لسانی اعتبار سے نکلتا ہے، وہ کیا ہے۔

۵- اس کے بعد فہم نصوص میں قدیم و جدید اہم مسالک، مثلا اس آیت کو سمجھنے میں جو تین چار آراء ہوں ان کا بیان ہو سکے تو فقہاء کا نام لیے بغیر پڑھایا جائے، تاکہ معروضی فہم و نقد ممکن ہو۔

۶- کونسی باتیں شریعتِ اصلیہ ہیں، اور کونسی باتیں فروعات ہیں (یعنی شریعت کی بنا پر فقہاء کے فتاوی ہیں)۔

۷- اس موضوع پر اہم کتب سے آگاہ کیا جائے۔

دوسری سطح

دوسری سطح کو ہم نے تفہیم کا نام دیا ہے۔ یہ وہ سطح ہے جہاں

۱- طالب علم کو یہ سکھایا جائے کہ ان فقہاء نے یہ آراء کیونکر اختیار کیں (لغت، اصول، دور، علاقہ، رواج کے اثرات وغیرہ)۔

۲- وہ اس رائے تک کیسے پہنچے۔ (فہم کا عمل)

۳- ان کا کونسا اصول ہے جس کی بنا پر انھوں نے یہ معنی لیے۔ یعنی اس خاص آیت میں یہ معنی لینے کے اصولی اسباب

۴- ایک جملہ ایک فقیہ کے ہاں یہ مطلب کیسے پارہا ہے، اور دوسرے کے نزدیک دوسرے معنی کیوں؟

۵- ایک فقیہ کے وہ کون سے اصول ہیں جس کی وجہ سے وہ دوسرے کی رائے کو لینے میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔

۶- دورِ جدید میں وہ کون کون سے فکری، عملی یا رواجی عوامل ہیں جو جدید دور میں آراء میں تنوع کا باعث ہیں، اور حکم الٰہی کے کس پہلو پر حملہ آور یا متصادم ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہم طالب علم کو یہ سمجھائیں کہ ایک فقیہ اس معنی تک کیسے پہنچا اور دوسرے فقیہ یا محدث کے مقابلے میں اس کے پاس وہ کیا استدلال تھا، جس کی بنا پر وہ دوسروں سے اختلاف کر رہا ہے۔

تیسری سطح

اس سطح کو ہم معرفت کا نام دینا چاہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر حکم الٰہی کو اس کے پورے دین کے اعتبار سے اسے سمجھا دیں۔ مثلا نکاح کی مثال زیر بحث ہے، تو ہم طالب علم کو پہلے دونوں مراحل کی تعلیم دینے کے بعد بتائیں کہ نکاح کے ضابطے کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے، دین کا جو مجموعی مقصد ہے اس میں اس ضابطے کا کیا کردار اور حصہ ہے۔ اس ضابطے کی کونسی چیزیں ناقابل ترک ہیں، اور کہاں بعض صورتوں میں رعایت دی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ یہ چیز بھی ایک مسلمان کے لیے کافی ہوتی ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، اس لیے وہ اسے مانے اور اس پر عمل کرے، لیکن دلوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اطمینان اور اس کے عمل پر وثوق سے لگے رہنے میں یہ علم نہ صرف ممد ہوگا، بلکہ اسے ابھارے گا بھی۔فہم دین کے اعتبار سے بھی یہ اسے احکام کی ایسی معرفت دے گا کہ وہ دین کے ہر حکم کے بارے میں پوری روشنی میں آجائے گا۔ اس فن پر ہمارے ہاں امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف موجود ہیں اور اس طرح کی بہت سی کتب ہمارے اسلاف و اخلاف نے لکھی ہیں: کسی نے دین کے کسی جزو پر، اور کسی نے پورے دین پر۔

یہی وہ چیز ہے جس پر فتوے کی صحت کا اصلا مدار ہے۔فتوے سے یہ خیال نہ کریں کہ فقہی فتوی دینا ہی مراد ہے، بلکہ محض دین کا مدعا و مقصود بتانا بھی مراد ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا مقلد سے مقلد ترین عالم دین بھی نیا فتوی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس نے قدیم علما کی بات کو صحیح سمجھا ہے تو وہ قدیم فتوے کو صحیح صحیح آگے پہنچا دیتا ہے، لیکن اگر وہ صحیح نہیں سمجھا ہو تو وہ اپنا ناقص فہم سائل کو منتقل کرتا ہے، تو یہ نیا فتوی بن جاتا ہے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں یہ روزانہ دیکھنے کو ملتا ہے، کہ ہم قدیم فتووں کے نام پر نئے فتوے سنتے اور دیتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس تیسرے درجے کے علم کی اشد ضرورت ہے۔

عمر کا لحاظ

ہمارے ہاں جدید تعلیم اداروں میں خاص طور سے جو نصاب تیار کیے گئے ہیں، یا جو کیے جارہے ہیں، وہ اس عنصر سے یکسر خالی ہیں۔ مثلا اسلامیات لازمی کا نصاب ہی دیکھیں، کسی نے معلومات پہنچانے کو اہمیت دی ہے، تو ان کا نصاب معلومات سے بوجھل ہو کر بوریت اور عدم تفہیم کا شکار ہو گیا ہے، اس کا تو خیال ہی نہیں کیا گیا کہ کونسی معلومات اس عمر میں سمجھ میں آتی ہیں کہ نہیں۔اور اگر ایک بات ایک عمر میں سمجھ میں آنے کی نہیں تو بتائی ہی کیوں جائے۔اس لیے از بس ضروری ہے کہ نصابی مندرجات تعلیمی عمر کے لحاظ سے ترتیب دیے جائیں۔

تعلیمی عمر سے ہماری مراد یہ ہے کہ طالب علم جس بات کو ذہنی طور پر سمجھنے کے لائق ہو وہی اسے پڑھائی جائے۔ ذہنی طور پر لائق ہونا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ طبعی عمر کے اس حصے میں ہو کہ اس بات کو سمجھ سکے، جیسے ہم پانچ سال کے عمر کے طالب علم کو وہ بات نہیں سکھا سکتے، جو اسے عمر کے پندرھویں سال میں آکر سمجھ آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اس علم کے دینے سے پہلے اس کو اس علم سے متعلق بنیادی علم دے دیا ہو۔ مثلا جب تک جمع تفریق نہ آتی ہو تو ریاضی میں الجبرا نہیں پڑھایا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ بتدریج تعلیم کے اصول میں طبعی اور علمی عمر کے لحاظ سے کورسز بنائے جائیں تاکہ طالب علم اس کو سمجھنے کے صحیح معنی میں قابل ہوں۔

بتدریج تعلیم

اس کا مطلب یہ ہے کہ

۱- ہم طالب علم کی عمر کے لحاظ سے نصاب کو تیار کریں۔

۲- ہم ہر مضمون کا نصاب اس طرح سے تیار کریں کہ وہ پہلے دن سے آخری دن تک ایک منطقی ترتیب سے اس علم میں داخل ہو۔

۳- ہم ہر مضمون کا نصاب اس طرح سے تیار کریں کہ اس کے مباحث کا تمام تر خاکہ طالب علموں پر اس طرح واضح ہو کہ وہ ایک فلو چارٹ کی صورت میں اس کے ذہن میں موجود رہے۔

منطقی ترتیب

منطقی ترتیب سے نصاب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے معمار ایک کے اوپر دوسری اینٹ لگاتے ہوئے پورے گھر کی تعمیر کرتا ہے، وہ پہلے ردے کے بعد تیسرا یا آخری ردہ نہیں لگاتا۔اسی طرح نصاب کا ہر سبق دراصل پہلے سبق کے اوپر رکھی جانے والی اینٹ کی طرح ہو۔ردے پر ردے کا لگنا علم کی تعمیر کی پختگی کا ضامن ہے۔مثلا الف ب پڑھائے بغیر الفاظ کا پڑھانا ناممکن ہے۔ الفاظ کے ابجد کی پہچان ہو گی تو الفاظ پڑھے جاسکیں گے۔ٹھیک اسی طرح جس طرح ابجد میں پہلے مکمل شکل پڑھائی جاتی ہے، پھر اس کی مختصر شکلیں، جو الفاظ بناتے وقت ان کی بنتی ہیں، اور یوں طالب علم اس کی تمام شکلیں پہچان لیتا ہے، اور عبارت کو پڑھنے لگ جاتا ہے۔ٹھیک دینی علوم میں بھی ہر بات اس طرح پڑھائی جائے کہ پہلے سب سے پہلی بات پھر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات پر قائم ہونے والی بات، اور پھر اس پر قائم ہونے والی اور یوں ایک مضمون مکمل پڑھا جائے۔

مضمون کا خاکہ

جب ایک مضمون اوپر کی ترتیب سے پڑھا یا جائے گا،جس کے مباحث کا باہمی تعلق طالب علم پر واضح ہو گا، تو اس کے ذہن میں اس مضمون کے مباحث کا ایک شجرہ نما خاکہ بنے گا۔یعنی یہ بات یہاں سے شروع ہوئی تھی، اس سے یہ بات ثابت ہوئی تھی پھر اس سے یہ بات نکلی تھی اور یوں آغاز سے اختتام تک اس کے مباحث کا ایک سائل گوشوارہ (flow chart) اس کے ذہن میں بنے گا۔جس سے زندگی بھر یہ مضمون اس کی گرفت میں رہے گا۔

ان تین پہلوؤں سے جب ہر سبق کو تدریج سے پڑھایا جائے گا تو انشاء اللہ طالب علم اس مضمون سے نہ صرف واقف ہو جائے گا، بلکہ اس کی گہرائی، حکمت اور بصیرت سے بھی آگاہ ہو جائے گا۔

تقلید کی متوازن پابندیوں کے ساتھ غیر مقلدانہ تعلیم

علم کی دنیا میں اسلاف کی تقلید اخلاف میں علم میں کمی کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے کہ جب میں نے اپنے امام کے حصار سے باہر ہی نہیں نکلنا ہے تو میں اس کے بتائے ہوئے علم تک ہی محدود رہوں گا، اور پھر میرے مسلک کی تمام اگلی نسلیں اسی علم کے اندر ہی رہیں گی، وہ اپنے امام کے برابر بھی علم حاصل نہ کرسکیں گی۔نہ دوسرے مسالک کو توجہ سے پڑھیں، سنیں یا سمجھیں گی،جس سے ان کا علم جامد ہو جائے گا۔ پھر جب وہ اپنے مسلک میں ہی بند رہتی رہیں تو جیسا ہم دیکھ رہے ہیں ایک وقت وہ آجاتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا مسلک ہی درست ترین مسلک ہے، کسی اور کی بات نہ سنو، تو پھر اس مسلک کے ماننے والوں میں ایک اور کمی آجاتی ہے کہ وہ اپنے ہی فکر کے استدلال سے بھی ناواقف ہو جاتے ہیں۔ مثلا آج اگر ہم احناف کے علما سے پوچھیں کہ رفع یدین والی احادیث کو کیوں نہیں مانتے، تو وہ اپنے اسلاف والا جواب نہیں دیتے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں یہ معلوم نہیں رہا کہ ان کے بزرگوں نے یہ روایات عملا کیوں اختیار نہیں کیں، یا یہ وہ جانتے تو ہیں، مگر اس کو کمزور دلیل سمجھتے ہیں، ایسا ہی معاملہ تمام مسالک کا ہے۔

لیکن متوازن قسم کی تقلید اتنی نقصان دہ نہیں ہے۔اور متوازن تقلید سے ہماری مراد وہ تقلید ہے جو امام محمد اور امام یوسف رحمہما اللہ نے حنفی رہتے ہوئے اختیار کی کہ آدمی اپنے مسلک کے اندر رہتے ہوئے، دوسرے مسالک کو دیانت داری سے پڑھے۔ دیگر مسالک اور اپنے مسلک کو معروضی طریقے سے جانے۔نقل وعقل کی روشنی میں ان کی ہر رائے کو پرکھے تاکہ وہ پوری طرح سے کم ازکم اپنے ہی مسلک کی حقانیت سے واقف ہو جائے۔

دیکھا جائے تو ایسا آدمی ہی اپنے مسلک کا بھی دفاع کر سکے گا، اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے بلند ہو کر یگانگت اور اتحاد امت کا نقیب بھی بن سکے گا۔ یہی وہ آدمی ہو گا کہ جو مجتہدانہ بصیرت سے نقد و اصلاح کا کام بھی کر سکے گا۔اور جب کبھی امت کو کسی مسئلے میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پڑے تو وہ اس میں بھی بصیرت افروز کارکردگی دکھا سکے گا۔لیکن وہ آدمی جو اپنے ہی مسلک سے بھی مجتہدانہ طریقے سے واقف نہیں ہے تو وہ ان میں سے کوئی ذمہ داری کما حقہ ادا نہیں کر سکے گا۔

عربی زبان کی تعلیم

زبان کی تعلیم علوم اسلامیہ کے اوپر دیے گئے ڈھانچے سے ذرا مختلف ہے، اس لیے ہم اسے الگ سے بیان کررہے ہیں۔عربی زبان کی تعلیم میں درج ذیل پانچ چیزوں کو ضرور شامل ہونا چاہیے۔

ا-زبان کا لسانی ڈھانچہ
(گرامر یا براہ راست طریقہ تدریس سے)

سب سے پہلے زبان کے لسانی ڈھانچے سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے پہلے گرامر پڑھائی جاتی ہے۔ پھر متون کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ دور جدید میں لسانی تعلیم کے براہ راست طریقے کو خاطر خواہ کامیابی ملی ہے۔ اسے اختیار کیا جانا چاہیے ۔ لیکن اگر اسے اپنانا ممکن نہ ہوتو گرامر ہی کی تعلیم کو نئے طریقوں سے دل نشیں

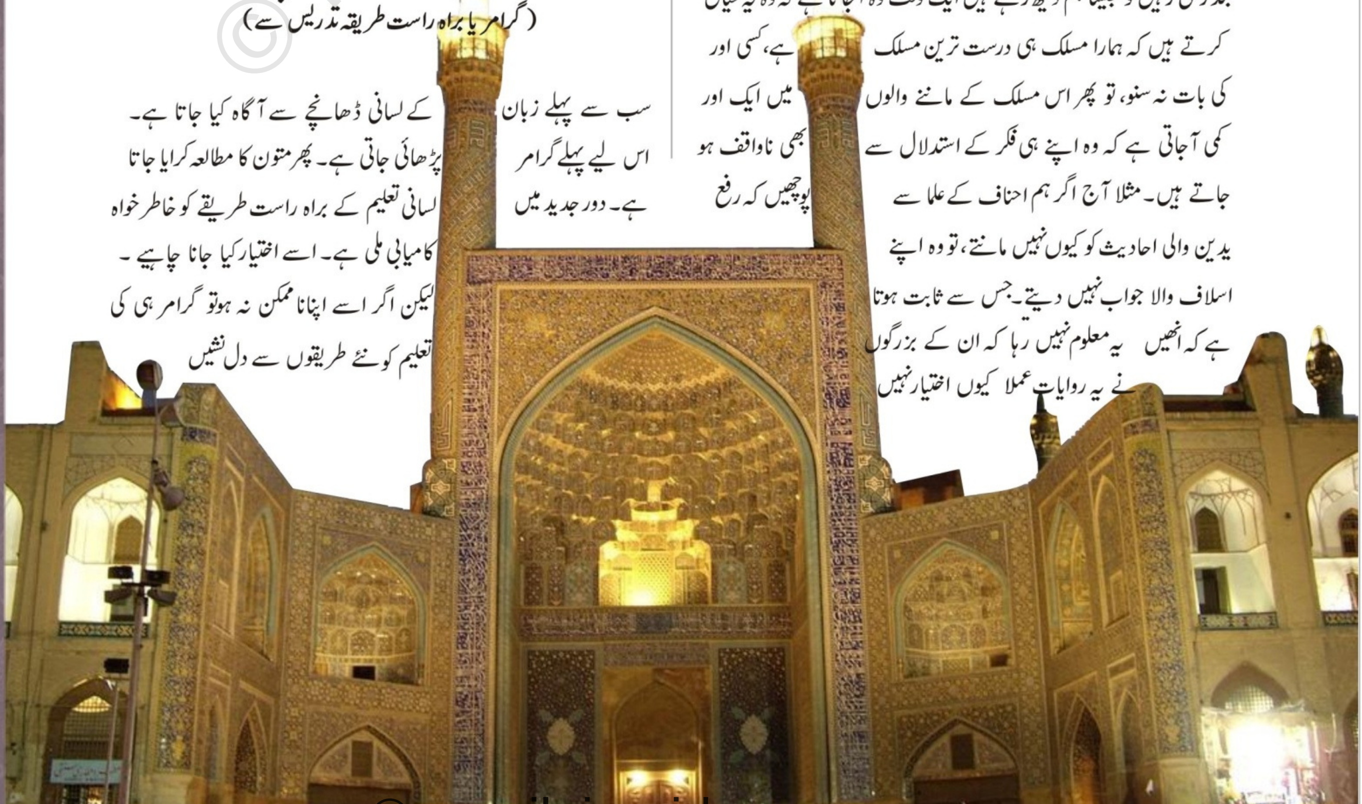

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنایا جاسکتا ہے۔ بہرحال پہلے عربی کے بنیادی لسانی ڈھانچے سے آگاہ کیا جائے، تاکہ طالب علم کو جملوں کی پہچان ہو۔

۲- ادبی اور تکنیکی متون کا مطالعہ

پہلے مرحلے کے بعد آسان ترین ادبی متون کا مطالعہ کرا کے مشکل ادبی متون تک لے جایا جائے، جیسے اچھی ادبی کہانیاں، تاکہ وہ لفظوں اور محاوروں اور جمل کے مواقعِ استعمال سے واقف ہو جائے۔ان کہانیوں کے ساتھ ساتھ یا بعد میں آسان سے مشکل شاعری، تاکہ طالب علم لفظوں اور جمل کے شعری استعمالات سے واقف ہوسکے، اور زبان کے اسالیب پر اس کی گرفت مضبوط ہو سکے۔ اس لیے کہ زبان کا علم دراصل اس بات کا علم ہے کہ لفظ کے معنی کیا ہیں اور وہ کہاں کہاں استعمال ہوسکتا ہے۔مثلا خوبصورت کا لفظ اچھے ذائقے کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا، لیکن اچھے شعر یا اچھی بات کے لیے ہوسکتا ہے، حالانکہ شعر اور بات کی کوئی صورت نہیں ہوتی، یا کم از کم خوبصورت بات، یا خوبصورت شعر کی ترکیب بولنے والا ان کی صورت کی خوبی بیان نہیں کر رہا ہوتا۔

زبان دراصل الفاظ، جمل اور اسالیب کا نام ہے، اور پھر اس بات کا کہ یہ الفاظ اور جملے اور اسالیب اس زبان میں کس کس موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلا اردو والے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کا محاورہ کس جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے جملہ نہیں محاورہ ہے۔ زبان کی اس طرح کی چیزوں پر گرفت ان متون کے مطالعے ہی سے حاصل ہوگی۔ اس لیے جاہلی، مخضرمی اور ابتدائی اسلامی شاعری کا تمام ذخیرہ اس مقصد سے پڑھایا جائے کہ وہ ان امور پر عبور حاصل کرلیں۔

ادبی چیزوں کے اس مطالعے کے بعد ایک معتد بہ انتخاب تکنیکی متون کا بھی ہو، مثلا تفسیر، شروحِ حدیث، فقہ، تاریخ اور منطق وغیرہ کی کتب کے اقتباسات کا ایک ایسا اچھا انتخاب ان کو پڑھادیا جائے کہ وہ اس طرح کی عبارتوں کو بھی سہولت سے پڑھ اور سمجھ سکیں۔

۳- عربی کے لسانی امتیازات

تیسرے مرحلے میں عربی زبان کی امتیازات سے آگاہی دی جائے۔ یعنی یہ زبان اسی بات کو کیسے بیان کرتی ہے، جو بات ہماری زبان میں ایک اور طریقے سے بیان ہوتی ہے۔مثلا عربی میں مثال ماری جاتی ہے، (ضرب اللہ مثلا) جبکہ اردو میں مثال دی جاتی ہے وغیرہ۔

۴- متون حدیث کا مطالعہ بطور لسانی ریڈر

عربی زبان کے الفاظ و اسالیب کا کا ایک اعلی ذخیرہ حدیث کے متون کی صورت میں بھی ہمارے پاس جمع ہے۔ اس کا انتخاب کرکے ایک ایسی کتاب تیار کی جائے۔ جو متون حدیث کے فہم کے لیے ایک راہ کھول دے۔

۵- مطالعہ قرآن بطور اعلی ترین ادبی کتاب

قرآن مجید عربی زبان کا سب سے مستند اور محفوظ ترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کو دینی کتاب کے طور پر پڑھانے سے پہلے اسے لسانی پہلو سے پڑھایا جائے تاکہ مطالعہ قرآن کے دوران میں دینی علوم کا طالب علم، جب تعلیم سے فراغت پائے تو وہ نہ صرف اس سے اخذِ علم کرسکے، بلکہ قرآن کی تاثیر اور اس کی روحانی فیض سے بھی بہریاب ہو سکے۔

طرز نگارش

نصاب کی تیاری میں جو کتب تیار کی جائیں۔ ان کا اسلوب نگارش سہل اور موضحِ خویش (self-explantory) ہو۔اس کی ترتیب مباحث نہایت مرتب اور منطقی ہو۔ اوپر ہم نے جو امور مباحثِ مضمون کے بارے میں ذکر کیے ہیں، وہی کتب کی تنصیف میں پیش نظر ہوں کہ

۱- علمی سطحوں کا تعین ہو
۲- بتدریج تعلیم ہو
۳- تقلید کی متوازن پابندیوں کے ساتھ تعلیم دی جائے

کتب کی تیاری میں بھی ان امور کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہاں دوبارہ اس تفصیل کی ضرورت نہیں۔

نصاب میں جدید علوم کا قابل قدر حصہ

جدید علوم سے آگاہی کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے، اس سے اب ہر شخص آگاہ ہے۔ میں یہاں اسی اہمیت کے پیش نظر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم میں سے وہ تمام اہم مضامین جو اسلام کے ایک طالب علم کے لیے ضروری ہیں، وہ بھی شامل نصاب کیے جائیں تاکہ ہمارا طالب علم نہ صرف پورے اعتماد سے معاشرے میں جا کر ہر سطح اور ہر میدان کے آدمی سے بات کرسکے، بلکہ وہ ان باتوں پر پوری بصیرت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ دینی نقطہ نظر کو بیان بھی کر سکے۔ یہ بالکل وہی عمل ہے جو ہمارے اسلاف نے بھی کیا تھا۔ جب انھوں نے منطق، فلسفہ وغیرہ کو نصاب کا حصہ بنایا تھا۔

یہ علم نہ صرف ہمارے طالب علموں کی ذہنی وسعت میں اضافہ کرے گا، بلکہ ان علوم کا رعب بھی دلوں سے نکالے گا۔ اس لیے کہ کسی چیز کا رعب اسی وقت تک قائم رہتا ہے، جب اس کی چکا چوند دور سے دکھائی دے رہی ہو، حقیقت جان لینے کے بعد وہ رعب جاتا رہتا ہے، جو حقیقی نہیں ہوتا۔

سائنس میں البتہ ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ وہ اس قدر ضرور پڑھا دی جائے کہ طالب علم نہ صرف اس کی اپروچ سے اچھی طرح واقف ہو جائے بلکہ ان اہم مباحث کو بھی اچھی طرح سمجھ لے، جو کسی نہ کسی طور اسلامی تعلیمات سے متعلق ہیں، جیسے بگ بینگ، نظریہ ارتقاء، جدید فلکیات، ایمبر یالوجی، وغیرہ۔

اس کے علاوہ سوشل سائنسز کا کافی اچھا تعارف ہونا چاہیے، خاص طور سے اس لیے کہ ان علوم کے تحقیقی طرز عمل کو سمجھ کر ہم، اسلامی علوم و معارف کو اسی ڈھنگ سے پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً استقراء کا جو نظریہ مسلمان علما (علامہ شاطبی وغیرہ) قطعیت کے طور پر تسلیم کرتے رہے ہیں کہ جب تمام انسان وجدانی امور کے بارے میں ایک بات کہیں تو وہ حقیقت ہوگی۔ یہ بات ان علوم میں بھی مانی جاتی ہے۔ مذہب کے لیے جو نیا چیلنج اس وقت اس کے انکار کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، اس میں اس طرز فکر سے ہم بہت سے چیزیں ذہن جدید سے منوا سکتے ہیں۔ اس لیے دعوت اسلامی کے عظیم فریضہ کی ادائیگی کے لیے یہ علوم نہایت مفید ہو سکتے ہیں۔

انگریزی زبان کی تدریس بھی اب لازمی سمجھ لینی چاہیے اس لیے کہ بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی، اب انگریزی ہمارے معاشرے میں صاحبِ علم ہونے کی علامت بن گئی ہے۔ اس لیے یہ آپ کو کوئی اور فائدہ دے یا نہ دے آپ کے مخاطب کو سننے پر آمادہ کرتی اور بولنے والے کو ایک اعتماد عطا کرتی ہے۔

نصاب کی تشکیل: ذہانتوں کی آبیاری

نصاب کی تشکیل میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے کہ اس نصاب سے گزرنے والا، نہ صرف علوم اسلامیہ سے آگاہ ہو جائے اور ان کی معرفت کی سطح تک کا عالم ہو جائے بلکہ علوم اسلامیہ اور جدید علوم کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت کی نمو ہو، اور وہ بڑے لوگوں کی طرح جدید امور کے حل میں اپنی ذہانت کا بہترین استعمال کر سکے۔ ہم نے تدریس کے حوالے سے جو ایک نقشہ اوپر پیش کیا ہے، وہ ذہانتوں کو تعمیر کرنے کا کام بھی کرے گا۔

ان اصلاحات کے بغیر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دین کے طلبہ میں وہ علمی شعور پیدا نہیں کر سکتے، جس کی دورِ جدید میں ضرورت ہے۔ ہمارے دینی طالب علم کو گہرے بصیرت افروز علم کی ضرورت ہے، جو ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسے اعتماد کی ضرورت ہے جو علوم جدیدہ اور انگریزی کی تعلیم سے اسے حاصل ہوگا۔

© rasailojaraid.com